محمد جعفر پھلواروی

# کیا انکم ٹیکس زکوٰۃ ہے؟

اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے لا اکراہ فی الدین یعنی دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک خوشی کا سودا ہے۔ بلاشبہ بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں دباؤ کی ضرورت پڑتی ہے لیکن یہ وہیں ہوتا ہے جہاں تفہیم سے کام نہ چلے اور عقل و شرافت کارگر نہ ہو۔ ہر شخص کا اپنا گھر اس خوش دلی اور دباؤ کے امتزاج کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتا ہے کم عقل افراد پر ہم کبھی کبھی دباؤ بھی ڈالتے ہیں کیونکہ ان میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ تمام مصلحتوں کی تہ تک فوراً پہنچ کر خوشی سے وہ حکم مان لیں۔ یہ مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ تعمیل حکم کرانے میں لمبی تاخیر مناسب نہیں ہوتی ہے۔ اور نہ اتنے انتظار کا موقع ہوتا ہے کہ معاملے کے تمام گوشوں پر غور و فکر کرا دیا جائے۔ ادھر سے وقت تنگ ادھر عقل کی کمی۔ اور کام کا ہونا ضروری ایسی حالت میں منطقی افہام و تفہیم کی بجائے دباؤ ہی کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جب اس میں عقل آجاتی ہے تو وہ خود بخود سمجھ لیتا ہے کہ ہمارے سرپرستوں کا وہ دباؤ صحیح اور مطابق مصلحت تھا۔

غرض دباؤ کی ضرورت تو پڑتی ہے لیکن یہ ایک محض عارضی اور مجبورانہ تقاضا ہوتا ہے۔ مقصود نہیں ہوتا۔ مقصود ہوتا ہے اس میں ایسی سمجھ پیدا کرنا جس میں کوئی دباؤ نہ محسوس کیا جائے بلکہ ایک رضا کارانہ اور خوش دلانہ جذبہ پیدا ہو جائے۔ جبر یا زبردستی سے دنیا میں نہ کوئی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ کوئی صالح نظام چل سکتا ہے۔ اکراہ سے زیادہ تر ایسا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے کہ اگر بات کی معقولیت واضح بھی ہو جائے تو ضد، ہٹ دھرمی، مخالفت اور انکار کا جذبہ چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اگر کسی جگہ اکراہ ناگزیر ہو تو اس کا انداز ایسا حسین ہونا چاہیئے کہ اوّلاً تو یہ اکراہ اتنا کم سے کم ہو کہ اس سے کم میں کام نہ چل سکتا ہو۔ دوسرے اصل مقصود (یعنی خوش دلی پیدا کرنا) نظروں سے اوجھل نہ ہو اور کسی وقت بھی اس کے اندر اس کم سے کم اکراہ کا غلط ردِ عمل نہ پیدا ہو۔ یہی ہے اکراہ اور خوش دلی کا حسین امتزاج۔ بایں ہمہ مقصود خوش دلی ہے، ایسی خوش دلی کہ اگر کسی کام میں اکراہ و جبر محسوس بھی ہو تو اس کو وہ خود خوشی کے ساتھ برداشت کرنا ضروری سمجھے۔ اس طرح پورا دین ہی لا اکراہ فی الدین کا مظہر بن جائے گا۔

اس کی بہترین مثال روزہ ہے۔ اگر آپ کسی بچے سے کہہ دیں کہ آج تمہیں کھانا نہیں ملے گا تو مچل جائے گا اور رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لے گا۔ لیکن جب رمضان آتا ہے تو یہی بچے نہ فقط روزہ رکھ لیتے ہیں بلکہ روزہ فرض نہ ہونے کے باوجود اور سرپرستوں کے منع کرنے کے باوجود روزے کی بھوک پیاس کو کسی خیانت کے بغیر ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں اور

اس جبر نفس میں وہ ایک روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ دیکھئے بھوک وہ بھی تھی اور بھوک یہ بھی ہے۔ لیکن دونوں میں کتنا آسمان و زمین کا فرق ہے؟ وہاں جبر، دباؤ، زبردستی اور اکراہ ہے اور یہاں خوش دلی، مسرت، رضا کاری ہے جو دباؤ ہے وہ خود اپنی خوشنودی کے ساتھ قبول کر لیا گیا ہے ـــــ دین اسلام ایسے ہی نظام اطاعت کا نام ہے جس میں سراسر خوش دلی ہو، اور اکراہ کا جو عنصر ہو وہ بھی اپنی خوشی سے رضا کاری میں تبدیل ہو گیا ہو۔

یہ ساری تمہیدیں اس لیے عرض کی گئی ہیں کہ زکوٰۃ کو بھی اسی زاویۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ زکوٰۃ کا تو لفظ ہی ایسا ہے جو اوپر کے بیان کردہ حقائق کی صاف صاف نشاندہی کرتا ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی بالیدگی کے بھی ہیں اور پاکیزگی کے بھی۔ بالیدگی یہ ہے کہ اس سے دولت میں ایسا اضافہ ہوتا ہے جو کسی خاص طبقے میں محصور ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی گردش سے پوری قوم ہی خوش حال ہو جاتی ہے۔ اور پاکیزگی یہ ہے کہ اس سے نہ فقط مال کا بلکہ روح اور اخلاق کا بھی تزکیہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روح کا تزکیہ اور بالیدگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک خوش دلی موجود نہ ہو۔

اگر زکوٰۃ بے دلی کے ساتھ ادا کی جائے تو وہ لفظاً زکوٰۃ ہو گی لیکن معنیً زکوٰۃ نہیں ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی انفاق بھی خوش دلی کے ساتھ جائز رستے میں کیا جائے تو وہ عین زکوٰۃ ہو گی خواہ فقہی اصطلاح میں اسے زکوٰۃ نہ کہا جائے۔ زکوٰۃ کے لیئے عام مفسرین کے نزدیک ایک لفظ "صدقہ" بھی ہے۔ اور آیہ انما الصدقٰت للفقراء میں صدقات کے معنی وہ زکوٰۃ ہی بتاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک انفاق، زکوٰۃ، صدقہ کا مفہوم الگ الگ ہے۔ یعنی:

(۱) انفاق کے معنی ہیں خرچ کرنا۔ انسان اپنی یا دوسروں کی جائز ضروریات پر جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ انفاق ہے

(۲) حکومت اسلامیہ جس قسم کی دولت پر جو ٹیکس کی شرح لگا دے وہ زکوٰۃ ہے۔

(۳) کوئی شخص اپنی خوشی سے جو کچھ زائد از مطالبۂ حکومت دے وہ صدقہ ہے (صدقے میں صدق اور خوش دلی ہوتی ہے یہ نہ ہو تو انسان مطالبے سے زیادہ دینے ہی کیوں لگا)

فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ صرف وہی ہے جس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں:

(الف) تمام ضروریات زندگی سے زائد مال ہو

(ب) ایک سال تک بے کار پڑا رہا ہو

(ج) نامی ہو

(د) قرض میں گھرا نہ ہو

(ر) مخصوص نصاب سے کم نہ ہو وغیرہ وغیرہ تو ڈھائی فی صد زکوٰۃ عائد ہو گی۔

یہ شرائط صرف مالِ تجارت یا سیم و زر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ زکوٰتیں اور بھی ہیں مثلاً:

(۱) فلاں قسم کی پیداوار پر اتنے فی صد زکوٰۃ ہو گی۔ اس کا نام عُشر ہے۔ عُشر کے معنی دسواں حصہ ہے لیکن یہ بعض حالات

میں بیسواں اور پانچواں بھی ہوتا ہے۔ اس میں بعض کے نزدیک نصاب ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔

(۲) فلاں قسم کے جانوروں پر اتنی زکوٰۃ ہوگی۔ اس میں بھی نصاب ہوتا ہے۔ اس زکوٰۃ کو صدقہ بھی کہتے ہیں۔

ہم نے تفصیلات کو عمداً چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومتِ اسلامیہ کچھ اور ٹیکس بھی لیتی ہے جیسے ضریبہ (ٹیکس) اور خراج (مالیہ) اور مکس (چنگی) کہتے ہیں۔

میاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم تو دیا ہے لیکن نصاب اور دوسری شرائط کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ تمام تفصیلات یا تو احادیث میں ہیں یا ان احادیث سے فقہاء نے استنباط و قیاس کیا ہے۔ عام طور پر ہمارے فقہاء ان تمام تفصیلات کو غیر متغیر سمجھتے ہیں اور ان کو جوں کا توں باقی رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ تمام تفصیلات مخصوص دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب نقشۂ زندگی یا DATA بدل جائے تو یہ احکام بھی بدل جائیں گے۔ قرآن نے جس چیز کو کھلا رکھا ہے اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ تغیر پذیر ہے اور بضرورت اس میں حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

(۱) عہدِ نبوت میں اور اس کے بعد عرصۂ دراز تک لوگوں کو وظائف سالانہ ملا کرتے تھے۔ اب ماہانہ (اور بعض جگہ ہفتے وار) ملتے ہیں۔ اس لیے اگر پہلے سالانہ زکوٰۃ لی جاتی تھی تو اب ماہوار (اور بعض جگہ ہفتے وار بھی) زکوٰۃ وصول کی جا سکتی ہے۔

(۲) اُس وقت نصاب دو سو درہم یا بیس دینار تھا اور یہ دونوں ہم قیمت تھے۔ مگر آج بیس دینار کی قیمت دو سو درہم سے بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا اب ان دونوں کے علاوہ کوئی اور رقم نصاب کے لیے مقرر کی جا سکتی ہے۔

(۳) اُس وقت یہ نصاب (مثلاً دو سو درہم) ایک انسان کے چھ مہینے کے لیے کافی تھے اور آج چھ دن کے لیے بھی کافی نہیں اس لیے کوئی ایسا نصاب مقرر کیا جا سکتا ہے جو دو سو درہم یا بیس دینار سے مختلف ہو۔

(۴) جن چیزوں پر اس وقت زکوٰۃ عائد کی گئی تھی ان کے علاوہ بھی بعض نئی چیزوں پر زکوٰۃ لگائی جا سکتی ہے جس طرح حضرت عمرؓ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کی تھی حالانکہ آپ سے پہلے یہ زکوٰۃ نہ تھی۔ اسی طرح خاص خاص فصلوں پر حضرت عمرؓ نے مختلف لگان قائم کیے جو پہلے نہ تھے۔

(۵) اسی اصول کے مطابق بعض نئے ٹیکسز (ضرائب) بھی لگائے جا سکتے ہیں۔

غرض یہ سب قدریں متبدل ہیں اور حالات و مقتضیات کے مطابق ان میں ردّ و بدل ہونے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ زمانے میں نئے نئے ذرائع معاش بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں اور معاشرے میں نئے نئے مصارف بھی نکلتے رہتے ہیں۔

اب سوال اور بڑا اہم سوال یہ ہے کہ کوئی اسلامی حکومت جو انکم ٹیکس وصول کرتی ہے وہ زکوٰۃ ہے

یا نہیں۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اسے زکوٰۃ مان لینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ موجودہ انکم ٹیکس زکوٰۃ ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ہمارے فقہی شکلِ زکوٰۃ سے جو فرق اس میں نظر آتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) فقہی نصاب دو سو درہم یا بیس دینار (دوسرے لفظوں میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہے، یا اس کی مالیت کے برابر مال تجارت) دوسری ملکتوں میں نصاب اس سے مختلف ہے مثلاً پاکستان میں اب چھ ہزار روپے سالانہ یعنی پانچ سو روپے ماہانہ نصاب ہے۔ اس کے بعد بھی کئی قسم کی چھوٹ دی جاتی ہے۔

(۲) پہلے سالانہ حساب تھا اور اب ماہانہ ہے۔

(۳) پہلے نصاب سے جس قدر بھی زیادہ دولت ہو اس کی شرح وہی ڈھائی فی صد ہے اور اب نصاب سے زائد مالیت پر جتنی مالیت زیادہ ہوتی چلی جائے گی اسی قدر شرح زکوٰۃ بھی بڑھتی جائے گی۔

(۴) پہلے پیداوار میں پانچواں، دسواں اور بیسواں ہے اور اب مالگزاری (ریونیو) کی شرح اس سے مختلف ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ اس قسم کی تبدیلیوں سے نفسِ زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی ادائیگی میں خوش دلی ہو۔ موجودہ انکم ٹیکس کو چونکہ لوگ زکوٰۃ نہیں سمجھتے اس لیے اس میں خوش دلی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اکثر لوگ اس ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنی آمدنی کو چھپاتے ہیں اور حساب کتاب کے رجسٹروں میں کئی طرح کی جعل سازیاں کرتے ہیں۔ انکم ٹیکس کو زکوٰۃ نہ سمجھنے کا سلسلہ دراصل انگریزی دورِ حکومت سے شروع ہوا اور اس وقت اسے زکوٰۃ نہ سمجھنا حق بجانب بھی تھا کیونکہ حکومتِ کافرہ کو اہلِ اسلام سے زکوٰۃ وصول کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن ایک اسلامی حکومت میں اسے زکوٰۃ نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اسے زکوٰۃ سمجھ لیا جائے تو بہت کم مسلمان ایسے ہوں گے جو اس میں ناخوش دلی اور بوجھ محسوس کریں اور اپنی آمدنی کو پوشیدہ رکھ کر انکم ٹیکس سے بچنے کی کوشش کریں۔

اب ایک بڑا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہمارے ادا کردہ انکم ٹیکس کا وہی مصرف لیا جاتا ہے جو قرآن نے زکوٰۃ و صدقات کا بتایا ہے؟ قرآن نے جو مصارف بتائے ہیں وہ یہ ہیں:

فقرا، مساکین، عملۂ تحصیل، مولفۃ القلوب، قرضدار، رہائی اسیر، فی سبیل اللہ، ابن سبیل ـــــ ان آٹھ مصارف کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اہلِ تفسیر و فقہ نے اس کے جو معانی بتائے ہیں وہ ابدی نہیں۔ ہم صرف چند اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

(۱) فقرار اور مساکین کا کوئی فرق اچھی طرح واضح نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک حضرت عمرؓ کی رائے قابلِ قبول ہے کہ فقرار سے مراد اہلِ اسلام کے نادار ہیں اور مساکین سے مراد ذمی اہلِ کتاب کے نادار۔

(۲) مولفۃ القلوب کو لوگ حضرت عمرؓ کے قول سے منسوخ کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ منسوخ نہیں۔ نیز اس میں صرف غیر مسلم ہی داخل نہیں۔ مسلمان بھی مولفۃ القلوب ہو سکتے ہیں۔

(۳) فقہا کے نزدیک ادائے زکوٰۃ کی ایک شرط "تملیک بلا معاوضہ" بھی ہے۔ ہمارے نزدیک اول الذکر چار مصرف میں تو یہ شرط صحیح ہے لیکن موخر الذکر چار میں یہ شرط ضروری نہیں۔ صرف ان مصارف میں آجانا کافی ہے۔

(۴) فقہا فی سبیل اللہ سے مراد صرف وہ حاجی یا غازی لیتے ہیں جو اپنے قافلے سے بچھڑ گیا ہو لیکن ہمارے نزدیک ہر کارِ خیر فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

بہر کیف کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکومتیں ان میں سے بہت سے مصارف کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اگر کسی جگہ کوئی مصرف پورا نہیں ہوتا تو زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جانے میں شبہہ نہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے میں بھی صدقات و زکوٰۃ کے بہت سے غلط مصرف لیے جاتے تھے لیکن ہمارے علم میں کسی مفتی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ زکوٰۃ نہ ادا کی جائے یا انہیں دینے سے زکوٰۃ نہیں ادا ہوگی۔

اس سلسلے میں چند ضروری نکتے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کا اصلی مقصد ایسی معاشی ہمواری پیدا کرنا ہے کہ ہر ایک متنفس کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں اور دولت کی تقسیم ایسے منصفانہ انداز سے ہو کہ کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔ یہ مقصد بلند اگر پیشِ نظر ہے اور ذہنی رجحان کا رخ اسی طرف قائم رہے تو ایسا کوئی اقدام بھی خلافِ دین نہ ہوگا جو اس مقصد کو پورا کرتا ہو۔ یوں سمجھیئے کہ اگر کسی روایت سے یہ ثابت ہے کہ فلاں دوا فلاں مرض کے لیے مفید ہے اور اب کوئی مسلمان یا غیر مسلم محقق ادویہ ایک نئی دوا دریافت کرے جو اسی مرض میں مفید تر ثابت ہو تو اسے اختیار کر لینا کوئی شرعی گناہ نہ ہوگا۔ یہی شکل مالی نظام کی ہے۔ صحیح تقسیم دولت کے لیے قرونِ اولیٰ میں بہترین نظام وہی ہو سکتا تھا جو اس وقت تجویز ہوا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے چاندی، سونے، پیداوار اور حیوانات کا جو نصاب مقرر فرمایا تھا وہ سب تقریباً ہم قیمت تھے۔ یعنی دو سو درہم = بیس دینار = چالیس بکری = پانچ اونٹ = پانچ وسق غلہ ——— اب ان کی قیمتوں میں کوئی تساوی نہیں رہی ہے بلکہ خاصا تفاوت ہو گیا ہے۔ بہر حال اس دور کے لیے حصولِ زکوٰۃ کا یہی بہتر نظام ہو سکتا تھا اور تقسیم دولت کے لیے جو ترغیبی و ترہیبی احکام دیئے گئے اور جن اصولوں پر عمل کیا گیا وہی موزوں ترین ہو سکتے تھے۔ لیکن اب جب کہ بدلے ہوئے ڈھانچے کے ساتھ اس نے ایک ترقی یافتہ شکل اختیار کر لی ہے تو اسے اختیار کر لینا کوئی شرعی گناہ نہیں۔ دیکھنا صرف یہ چاہیئے کہ

اس سے مقصدِ زکوٰۃ بہتر طریق پر پورا ہوتا ہے یا نہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد بڑی خوبی سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ: توخذ من اغنیائھم و ترد علیٰ فقرائھم یعنی امیروں سے لے کر غریبوں کو دو۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ لیا جاتا ہے وہ زائد (از نصاب) مال پر لیا جاتا ہے اور ان کی طرف اسے ردّ کیا جاتا ہے جن کے پاس کم از نصاب ہے۔ اگر امیروں سے لے کر امیروں ہی پر صرف کیا جائے تو یہ مصرفِ زکوٰۃ نہ ہوگا۔ پھر یہ بھی خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ نظامِ زکوٰۃ کا یہ مقصد نہیں کہ ہمیشہ ایک طبقہ امیر اور ایک غریب بھیک منگا رہے جسے امیر طبقہ خیرات دے دے کر ثوابِ دارین حاصل کرتا رہے۔ زکوٰۃ کا یہ مقصد قطعاً نہیں بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ معاشرے میں گردشِ دولت سے ایسی معاشی ہمواری پیدا کر دی جائے کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ باقی رہے۔ یعنی سب خوش حال ہو جائیں:

کس نباشد در جہاں محتاج کس　　نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

ایسی معاشی ہمواری جس انداز سے بھی پیدا ہو وہ عین نظامِ زکوٰۃ ہے۔ قدغن صرف وہاں لگے گی جہاں اسلام کی واضح ممانعت موجود ہو۔ اگر ممانعت موجود نہ ہو تو ہر وہ چیز عین اسلامی ہے جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہو۔

تیسرا نکتہ یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ بہت سے متمدن ممالک میں ٹیکس لگانے کا جو نظام رائج ہے وہ اگرچہ ہمارے پرانے فقہی نظامِ زکوٰۃ سے مختلف ہے لیکن اس سے مقصدِ زکوٰۃ زیادہ بہتر طریق پر پورا ہوتا ہے۔ پسماندہ ممالک ان کی نقل تو ضرور کرتے ہیں لیکن ادھوری نقل ہونے کی وجہ سے نتائج خاطر خواہ نہیں نکل سکتے اور نہیں نکلتے۔ ادھوری نقل کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس وصول کرنے میں تو نقالی کرتے ہیں لیکن اس کی تقسیم میں نقل نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ توخذ من اغنیائھم پر عمل شدت سے ہوتا ہے لیکن ترد علیٰ فقرائھم پر عمل نہیں ہوتا۔ جس سے خوش حالی میں لیا جائے اس کو بدحالی میں دینا بھی اخلاقی فرض ہے۔

متمدن ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ تمام افرادِ ملک کی ضروریاتِ زندگی معاشرے کے نمائندوں (یعنی ہیئت حاکمہ) کے ذمے ہوتی ہے۔ ان کی تعلیم پر ایک پائی خرچ نہیں ہوتی۔ دوا علاج میں کوئی خرچ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بیروزگار ہو جائے تو اسے وظیفہ ملتا ہے۔ ایک تو خود حکومت بیروزگاری کا الاؤنس دیتی ہے۔ دوسرے اس کی یونین دیتی ہے۔ تیسرے بیروزگاری انشورنس کمپنی دیتی ہے۔ یہ انگلستان کا نظامِ معاشی ہے۔ اور سویڈن میں تو مکان بھی حکومت ہی کے ذمے ہے اور روزگار مہیا کرنا بھی۔ اگر کوئی بے روزگار ہو تو حکومت برسرِ روزگار ہونے تک تین سو روپے ماہانہ دیتی ہے ـــــ یہ بہت مختصر نقشہ ہے وہاں کی معاشی سرپرستی کا۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ ان ممالک میں اگر دولت مندوں سے ساڑھے پندرہ آنے فی روپیہ تک ہی ٹیکس لے لیا جاتا ہے تو کم مایہ لوگوں کو

بے روزگاری میں سہارا بھی دیا جاتا ہے اور یہی سب سے بڑا مقصد ہے نظامِ زکوٰۃ کا۔ امریکہ میں تو ایک مرحلے پر آکر روپے میں پورے سولہ آنے ہی ٹیکس میں لے لیے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی قانون ہے کہ اگر وہ فاضلہ دولت کو کسی کارِ خیر میں لگا دیں تو اتنی پوری رقم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت افراد سے جو رقم لے کر کسی کارِ خیر میں لگاتی وہ رقم اگر خود صاحبِ رقم ہی لگا دے تو حکومت کو اس میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ امریکہ میں جو متعدد فاؤنڈیشن Foundation اس وقت قائم ہیں وہ اسی اصول کے ثمرات ہیں۔

غرض اسلامی حکومت کا اصل مفہوم ایک فلاحی مملکت ہے اور وہاں ٹیکیشن کا نظام اس کی وصولی اور اس کے مصارف سب کا مقصد فلاحیت ہے نہ کہ محض رسم کی پیروی۔ پس آج کے متمدن ممالک میں جو اصولِ فلاحیت ہے اسے اختیار کر لینے سے کوئی اسلامی حکومت غیر اسلامی نہیں ہو جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نقل ادھوری نہ ہو۔ بلکہ پوری ہو بلکہ اضافاتِ مفیدہ کے ساتھ ہو۔ لینے میں اقدام اور دینے میں گریز کرنے سے وہ خوش دلی نہیں پیدا ہو سکتی جو زکوٰۃ کی جان ہے۔ یہ خوش دلی اسی وقت پیدا ہوگی جب زکوٰۃ یا ٹیکس ادا کرنے والوں کو یہ نظر آئے کہ ان سے لی ہوئی رقم فلاحِ عامہ پر صرف ہو رہی ہے۔

---


# کمرشل انٹرسٹ یا تجارتی سُود

مصنفہ محمد جعفر شاہ پھلواروی

ہمارے معاشرے میں کمرشل انٹرسٹ یا تجارتی سود کا مسئلہ عرصۂ دراز سے لاینحل چلا آرہا ہے اور اہلِ علم کو اِدھر توجہ کرنے کی نوبت ہی بہت کم آئی ہے۔ اور یہ مسئلہ ہے بھی بہت نازک کیونکہ ایک طرف سود (ربا) حرام ہے اور دوسری جانب ہر ملک کا کاروبار اسی پر چل رہا ہے۔ اس کتاب میں اس کے تمام نازک ترین گوشوں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔

قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور


---